اللہ تعالیٰ کی صفت حلم

(خطبہ جمعہ فرمودہ ۲۳ / مارچ ۱۹۸۴ء بمقام مسجد اقصیٰ ربوہ)

تشہد وتعوذ اور سورۂ فاتحہ کے بعد حضور نے مندرجہ ذیل آیت قرآنی کی تلاوت فرمائی:

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴿۴۵﴾ (بنی اسرائیل: ۴۵)

اور پھر فرمایا:

یہ آیت جس کی میں نے تلاوت کی ہے اس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ ساتوں آسمان وَالْاَرْضُ اور زمین بھی اور جو کچھ بھی ان دونوں میں ہے یعنی تمام کی تمام کائنات اور اس کے اندر جو چیزیں بھی مخفی ہیں ان میں سے ہر ایک چیز خدا تعالیٰ کی تسبیح کر رہی ہے اور اس کی حمد بیان کرتی ہے لیکن تم لوگ ان کی زبان کو سمجھتے نہیں، وہ جس زبان میں حمد کرتے ہیں جس طرح خدا کی تسبیح بیان کرتے ہیں تم اس کو نہیں سمجھتے اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا اللہ تعالیٰ بہت حلیم اور بہت غفور ہے۔

گزشتہ خطبہ میں مَیں نے یہ بیان کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں اپنی صفات کو مختلف رنگ میں پھیر پھیر کر بیان فرماتا ہے اور جس موقع اور محل کے مطابق کسی صفت کا بیان ہوتا ہے اس سے اس صفت پر ایک خاص روشنی پڑتی ہے اور بعض دفعہ کسی ایک صفت کے ساتھ ایک اور دوسری

صفت کو ملا دیتا ہے بعض دفعہ ایک اور صفت کے ساتھ ایک اور دوسری صفت کو ملا دیتا ہے اور ان سب کو مجموعی نظر سے دیکھیں تو نئے نئے مضمون ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

عموماً قرآن کریم کا ترجمہ پڑھنے والے قرآن کریم پر اس طرح گزر جاتے ہیں کہ جو معانی بیان ہو رہے ہیں وہ پڑھنے کے بعد، خدا تعالیٰ کی صفت کے بیان پر اس طرح غور نہیں کرتے کہ ان معانی سے اُس کا تعلق کیا ہے حالانکہ ہر آیت کے آخر پر جب صفات بیان ہوتی ہیں یا جن جن آیات کے آخر پر صفات بیان ہوتی ہیں انکا اُن سے پہلے گزرے ہوئے مضمون سے گہرا تعلق ہوتا ہے اور اگر آپ ان پر غور کرنے کی عادت ڈالیں تو یہ دیکھ کر حیران ہوں گے کہ وہ صفات اگر ڈکشنریوں میں تلاش کی جائیں اور ان کے معانی پر غور کیا جائے تو تمام دنیا کی ڈکشنریاں بڑے سے بڑے عالم کی ڈکشنری بھی اس صفت پر وہ روشنی نہیں ڈالتی نہ ڈال سکتی ہے جو قرآن کریم کی آیات ڈال دیتی ہیں اور حیرت انگیز نئے نئے مطالب انسان کے سامنے اُبھرتے ہیں۔ اس لحاظ سے صفات باری تعالیٰ پر غور ایک بہت ہی بڑا مضمون بن جاتا ہے اور عمداً میں اس کو چھوڑتا رہا ہوں کیونکہ پھر یہ ایک خطبہ کا معاملہ نہیں رہے گا بلکہ متعدد خطبات صرف ایک ایک صفت پر دے کر بھی پھر بھی تشنگی باقی رہ جائے گی۔

لیکن گزشتہ خطبہ کے بعد مجھے خیال آیا کہ نمونۃً خدا تعالیٰ کی حلیم صفت کے متعلق احباب جماعت کو بتاؤں کہ متفرق جگہ پر جب صفت آتی ہے تو اس صفت کے اندر کیا کیا نئے معانی جلوہ گر ہوتے ہیں تا کہ جماعت کو یہ عادت پڑے کہ خدا تعالیٰ کی صفات پر ان مواقع کے لحاظ سے غور کرے جن مواقع پر قرآن کریم میں وہ صفات بیان ہوئی ہیں اور بعض دفعہ تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی بھی تعلق نہیں۔ دو تین مثالیں میں نے چنی ہیں ان پر ظاہری نظر سے جب غور کریں تو معلوم ہوگا کہ بظاہر کوئی تعلق نہیں ہے ''حلیم'' کا اس بات سے کیا تعلق ہے جو بیان ہوئی ہے لیکن مزید غور سے ایک حیرت انگیز علم کا جہان آیت کے سامنے ابھر آئے گا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تمام آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے اندر ہے ہر چیز ہماری تسبیح بھی کر رہی ہے اور حمد بھی کر رہی ہے اور تم اس کی زبان کو سمجھتے نہیں۔ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا خدا حلیم ہے۔ صفتِ حلیم کا کیا تعلق ہے اس چیز سے کہ ساری چیزیں تسبیح بیان کر رہی ہیں اور تم نہیں سمجھتے اور اللہ حلیم ہے؟ تو پہلے تو یہ معلوم کرنا چاہئے کہ کس طرح حمد بیان کر رہی ہیں؟ کس طرح خدا کی تسبیح

بیان کر رہی ہیں سب چیزیں؟

اس کے دو پہلو ہیں، اوّل تو یہ کہ انسان شروع میں جب خدا تعالیٰ کی کائنات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا تو اس کو یہ تو احساس تھا کہ جانوروں میں کسی قسم کا شعور ہے لیکن جانوروں سے آگے وہ کسی شعور کا قائل نہیں تھا اور تسبیح اور حمد کا ایک قسم کے شعور سے بھی تعلق ہے۔ اس پہلو سے جب ہم غور کرتے ہیں تو ایک زمانہ انسان پر ایسا آیا بلکہ اس سے پہلے زمانہ میں جائیں تو یہ کہنا چاہئے کہ ایک زمانہ انسان پر ایسا آیا کہ جب وہ سوائے انسان کے کسی کو باشعور نہیں سمجھتا تھا۔ جانور اس کے سامنے کوئی بھی حقیقت نہیں رکھتے تھے جیسے ان میں جان ہی نہ ہو۔ یہ آغاز تھا انسان کا بلکہ ایک ایسا دور تھا کہ ہر جاندار اپنے آپ ہی کو باشعور سمجھتا تھا اس لئے غیر کا احساس نہیں تھا۔ غیر کا احساس تب پیدا ہوتا ہے جب اس کو باشعور سمجھے اور انسانی زندگی پر اور اس سے پہلے حیوانی زندگی پر بہت لمبا دور ایسا گزر چکا ہے کہ ہر وجود صرف اپنے آپ کو صاحب احساس سمجھتا تھا اور کسی دوسرے وجود میں احساس کا تصور ہی نہیں پایا جاتا تھا۔ جوں جوں دور آگے بڑھا ہے اور انسان نے ترقی کی ہے اس کو یہ احساس پیدا ہونا شروع ہوا کہ اوروں میں بھی یہ احساس ہے۔ پہلے تو یہ احساس جانوروں تک پہنچا پھر زیادہ لطافت اختیار کرنے لگا اور انسانی احساس نے بھی ترقی شروع کی ان معنوں میں کہ دوسرے کے متعلق احساس کے معاملہ میں زیادہ باشعور ہو گیا دوسرے انسانوں کے احساس کے بارہ میں بھی زیادہ باشعور ہو گیا۔

تو اندرونی طور پر بھی احساس میں مزید لطافتیں اور مزید وسعتیں پیدا ہونی شروع ہوئیں اور بیرونی طور پر بھی احساس میں مزید لطافتیں اور مزید وسعتیں پیدا ہونی شروع ہوئیں یہاں تک کہ جب انسان نے علم میں زیادہ ترقی کی تو اس نے یہ محسوس کیا کہ صرف جاندار ہی حساس نہیں بلکہ پودے بھی حساس ہیں اور پودوں میں بھی ایک قسم کی جان ہے، نہ صرف جان ہے بلکہ احساس رکھتے ہیں اور کوئی شعور رکھتے ہیں۔ اب تک ان کا نروس سسٹم (Nervous System) تو انسان معلوم نہیں کر سکا کہ پودوں کے اندر اعصاب ہیں اور ان اعصاب کے ذریعہ وہ محسوس کرتے ہیں لیکن اس بات کے قطعی شواہد موجود ہیں کہ پودوں میں احساس پایا جاتا ہے اور اب جو امریکہ میں ریسرچ ہو رہی ہے لائٹ ڈیٹیکٹرز (Light Detectors) کے ذریعہ پودوں کے اوپر۔ اُس سے تو اگر چہ ابھی دعویٰ کی حد تک ہے لیکن اگر وہ دعوے 1/10 حصہ بھی درست ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ پودوں کا شعور

بعض لحاظ سے انسانی شعور سے زیادہ باریک ہے اور حیرت انگیز وسعتیں رکھتا ہے۔ مثلاً یہ دعویٰ کیا جارہا ہے کہ اگر ایک پودے کے سامنے ایک قتل ہوتو وہ پودا اس قاتل کے معاملے میں اتنا شدید ردِ عمل رکھتا ہے کہ اگر دوبارہ وہ قاتل اس کے سامنے آئے اور باریک بجلی کے آلات سے جو پودے پر لگا دیئے گئے ہوں یہ معلوم کرنا چاہے انسان کہ مختلف آدمی اس کے سامنے سے گزرتے رہے ہیں اُن میں سے قاتل کون ہے تو جب بھی قاتل سامنے آئے گا وہ پودا ردِ عمل دکھائے گا۔ کس حد تک یہ درست ہے اور کس حد تک یقینی بات ہے اس میں ابھی بہت سی تحقیق کی گنجائش موجود ہے لیکن بعض کام کرنے والے جنہوں نے ساری زندگی اس پر صرف کی ہے وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ پودا جھوٹے آدمی کو سچے آدمی سے الگ کر کے پہچان لیتا ہے۔

تو بہر حال شعور کے بارہ میں انسان کا شعور اس طرح ترقی کرتا رہا کہ اپنے سوا غیر انسانوں کے شعور کے متعلق بھی احساس بڑھا اور وسعت پذیر ہوا اور غیر انسانوں کے متعلق یعنی جانداروں کے متعلق بھی اس کا شعور بڑھا اور وسعت پذیر ہوا یہاں تک کہ وہ نباتات کی حد میں داخل ہو گیا اور اب یہ تسلیم کرتا ہے کہ نباتات میں بھی شعور موجود ہے اور ہرگز بعید نہیں اور جیسا کہ قرآن کریم کی آیت سے ثابت ہوتا ہے آخر انسان اس نتیجے پر پہنچے کہ کائنات میں کوئی چیز بھی شعور سے کلیتہً خالی نہیں۔ ہاں شعور کے مراتب ہیں اور درجے ہیں جس کو ہم بے جان چیز سمجھتے ہیں وہ شعور کے ادنیٰ درجہ پر واقع ہیں لیکن شعور سے خالی نہیں اور ہر ایک باشعور اپنے شعور کے دائرہ کے مطابق تسبیح کر رہا ہے اللہ تعالیٰ کی اس دائرے کے مطابق اس کی حمد بیان کر رہا ہے۔ تو ایک تو اس آیت کے یہ معنی ہیں۔

اور دوسرے یہ معانی کہ زبانِ حال سے ہر چیز خدا تعالیٰ کی حمد بیان کر رہی ہے یعنی خدا تعالیٰ نے جو صنعت پیدا فرمائی ہے وہ اتنی حیرت انگیز ہے کہ وہ صنعت صانع کے حسن صنعت کی طرف دلالت کرتی ہے۔ وہ صنعت اپنے وجود سے خدا تعالیٰ کی تسبیح بھی کر رہی ہے اور اس کی حمد بھی بیان کر رہی ہے اور ایک بھی خدا کی صنعت ایسی نہیں جس میں یہ دو باتیں نہ پائی جاتی ہوں کہ وہ گواہی دے رہی ہو کہ میرا خالق تمام نقائص سے پاک ہے اور میرا خالق تمام صفات حسنہ سے متصف ہے۔ اس معاملہ میں بھی انسانی تحقیق نے حیرت انگیز چیزیں دریافت کی ہیں اور بہت سے جانوروں کے متعلق جو تحقیق ہو رہی ہے اس سے انسان حیرت میں ڈوب جاتا ہے کہ ہر جانور ایک عظیم الشان جہان

ہے اور اپنے اندر اور اتنے حیرت انگیز اس کے اندر باریک مصالح کارفرما ہیں ایک باشعور ہستی کے کہ ان پر غور کرتے چلے جاؤ تو ہر جانور خدا کی ہستی کا ایک عجیب ثبوت بن جاتا ہے۔ اب تو یہ تحقیق بہت بڑا علم بن چکی ہے لیکن اتنا بڑا علم بننے کے باوجود کسی جانور کی ایک باریک سی صفت پر بھی پورا عبور حاصل نہیں کر سکی مثلاً متفرق تحقیقات میں ایک تحقیق اس بات پر ہو رہی ہے بڑے حصہ سے کہ جانور اپنے گھروں تک کس طرح پہنچتے ہیں دور جانے کے بعد ان کو کیسے معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے کس سمت میں جانا ہے؟

اور سب سے پہلے اس معاملے میں شہد کی مکھی نے انسان کو حیران کیا۔ چنانچہ ارسطو نے سب سے پہلے اس بات پر غور کیا اور اس معمہ کو دنیا کے سامنے پیش کیا کہ شہد کی مکھی میں ایک حیرت انگیز ایک خصلت پائی جاتی ہے، ایک اہلیت پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے چھتے سے دور چلی جاتی ہے اور بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ وہ چھتے تک واپس پہنچے لیکن پھر پہنچ جاتی ہے۔ اس پر جو تحقیق ہوئی تو بہت لمبے عرصہ تک انسان اس کی وجہ کو پا نہیں سکا لیکن 1914ء میں ایک سائنسدان نے سب سے پہلے اس کا نام فان فش (Von Fisch) تھا، فان فش نے یہ حیرت انگیز بات شہد کی مکھی کے متعلق دریافت کی کہ شہد کی مکھی کا دیکھنے کا شعور اور اُسکی دیکھنے کی دنیا انسان سے بالکل الگ ہے۔ ہم جس روشنی کو دیکھ رہے ہیں اس روشنی سے ایک الگ روشنی کی دنیا میں وہ رہتی ہے۔ عام شعاعیں جو ہم دیکھتے ہیں ان کو وہ نہیں دیکھتی بلکہ الٹراوائیلٹ شعاعوں کی قسم ہے اُس جہاں میں وہ رہتی ہے۔

الٹراوائیلٹ کا جہان انسانی جہان سے بالکل مختلف ہے۔ ہم جو چیزیں دیکھ رہے ہیں، جو ہمیں یہ رنگ نظر آ رہے ہیں، جو طرزیں نظر آ رہی ہیں، جو شیڈ نظر آ رہے ہیں اگر یہاں یہ روشنی نہ ہو جو ہم دیکھ سکتے ہیں اور صرف الٹراوائیلٹ ہوں تو ہم کلیتہً اندھے ہو جائیں گے۔ ایک ادنیٰ ذرہ بھی ہمیں نظر نہیں آئے گا، ایک بڑی سے بڑی چیز بھی نظر نہیں آئے گی کیونکہ الٹراوائیلٹ کو دیکھنے کی خدا تعالیٰ نے انسان کو صلاحیت ہی نہیں بخشی اور شہد کی مکھی کے لئے اس روشنی کی کوئی حقیقت نہیں۔ وہ الٹرا وائیلٹ روشنی سے ایک بالکل مختلف جہان دیکھ رہی ہے اپنا اور اسی روشنی کے ذریعہ وہ پھولوں کا رس بھی چوستی ہے اور اسی روشنی کے ذریعہ وہ یہ معلوم کرتی ہے کہ کہاں شہد ہے کہاں نہیں اور اس کے سارے References اپنی ذات کے ساتھ متعلق رکھنے والے، سارے حوالے اس

الٹراوائیلٹ روشنی سے ہیں۔

یہ جب تحقیق سامنے آئی سائنسدانوں کے تو ایک نیا جہان علم کا کھل گیا۔ انہوں نے دوسرے جانوروں پر جو تحقیق شروع کی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ہر جانور کی سماعت کا جہان بھی اپنا ہے، اور اس کا روشنی کا جہان بھی اپنا ہے۔ بظاہر ہم ایک دنیا میں بسر کر رہے ہیں لیکن ہر جانور کو ایک اور دنیا نظر آ رہی ہے اور اپنی دنیا میں وہ کامل ہے اس کو ہر چیز مہیا ہے اپنی دنیا میں جو انسان سمجھتا ہے کہ اس کو مہیا نہیں اور ہمیں مہیا ہے۔ اگر اس کی دنیا کے اعصاب اور اُس کی دنیا کی حواس خمسہ انسان کو نصیب ہوتے تو پھر انسان کی دنیا اس کے لئے اندھی ہو جاتی اور وہ ایک نئی دنیا میں چلا جاتا اور سمجھتا کہ انسان کو کچھ نصیب نہیں ہے اور سب کچھ مجھے نصیب ہے۔ حیرت انگیز خدا ہے ہمارا جس نے کائنات کے ہر ذرہ میں ایسا حسن رکھ دیا کہ اس حسن کے ہر تجزیہ میں انسان ایک نیا حسن کا جہان پاتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس کے بعد ہم اس کو نہیں سمجھتے اللہ تعالیٰ جانتا ہے پھر حلیم کا کیا مطلب ہوا؟ حلیم کا مطلب ہے ایسا صاحب رشد، ایسا صناع، ایسا باکمال وجود جو حوصلہ بڑا رکھتا ہو اور اس بات سے بے نیاز ہو کہ دنیا اس کے حسن کی تعریف کر رہی ہے کہ نہیں کر رہی، اس کی عقل کو جانچ بھی رہی ہے یا نہیں، وہ اپنی ذات میں حلم رکھتا ہے، اس کے اندر ایک وقار پایا جاتا ہے، اس کی عقل میں اور اس کی صناعی اس بات کی محتاج نہیں کہ کوئی دوسرا تعریف کرے گا تو وہ اچھا صناع رہے گا بالکل بے نیاز ہے ان باتوں سے؟ جیسا کہ آپ نے بچپن میں وہ کہانی پڑھی ہوگی ایک نجار، ایک ترکھان ایک جنگلہ بنا رہا تھا کسی کے لئے جس پر اس نے انگوروں کی بیل چڑھانی تھی اور اس لئے اس نے سستا سودا کیا اس سے کہ ڈھانپ تو لے گی یہ بیل اس کو رندا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ خوبصورت بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن وہ جب آدمی دیکھنے کے لئے آیا کہ وہ کس طرح کا کام کر رہا ہے، تو اس نے دیکھا کہ بڑی محنت کر رہا ہے اور بڑی صفائی کر رہا ہے اُس کی اور بڑے رندے پھیر رہا ہے تو حیران ہو کر اس نے کہا کہ تم یہ کیا کر رہے ہو؟ میں نے تم سے جو سودا کیا ہے تھوڑے پیسوں کا ہے، تھوڑے کام کا ہے۔ اگر تمہارا خیال ہو کہ اچھا کام کر کے مجھ سے پیسے زیادہ لے لو گے تو میں بالکل نہیں دوں گا تمہیں۔ اس نے کہا آپ بالکل فکر نہ کریں میں اپنے سودے پر قائم ہوں مگر آپ کے ذوق کے بد ہونے کے نتیجہ میں اپنی صناعی کو کس طرح بگاڑ لوں آپکا ذوق بد ہے تو میری صنعت کیوں اس سے متاثر ہو جائے،

میں تو اپنے حسن صنعت کو بگڑنے نہیں دوں گا، میں تو وہی چیز بناؤں گا جو مجھے پسند آتی ہے اور جس کے اوپر میں فخر کر سکتا ہوں۔

تو انسان میں بھی جب یہ صفت پیدا ہوتی ہے حلیمی کی تو اس کے اندر ایک نیا جہان پیدا کر دیتی ہے۔ ہر صنعت کار میں ایک نئی عظمت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر صاحب فہم وعقل میں ایک نئی عظمت کردار آجاتی ہے اور انسانوں کے اندر رہتے ہوئے بھی وہ ایک نیا وجود بن جاتا ہے۔

تو یہ قرآن کریم میں جو خدا تعالیٰ کی صفات بیان ہوئی ہیں اور جن جن مواقع پر بیان ہوئی ہیں ان پر غور کریں آپ تو پھر آپ کو اپنی تربیت کا ایک نیا سلیقہ آجائے گا، ایک نیا ادب نصیب ہوگا اور اسی دنیا میں رہتے ہوئے احمدی جوان باتوں پر غور کر رہا ہوگا وہ بالکل ایک نیا وجود پا رہا ہوگا۔ یہ ہے قرآن کریم کی دولت اور عظمت جس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اب دیکھو خدا تعالیٰ کی وہ تمام صفات حسنہ جو اس کی صنعت کاری میں کہیں داخل ہوئی ہیں وہ کتنے لمبے عرصہ تک اوجھل رہی ہیں کائنات سے۔ انسانی دور تو بہت ہی مختصر ہے جس میں اس نے سمجھنا شروع کیا انسانی دور کا وہ دور جو سمجھ میں داخل ہوا ہے وہ کوئی بھی حیثیت نہیں رکھتا اس دور کے زمانے کے مقابل پر جب انسان ناسمجھی میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ اگر کائنات کو چوبیس گھنٹوں میں تقسیم کیا جائے آغاز سے لے کر اب تک تو انسان کی پیدائش آخری سیکنڈ کے کچھ حصے کے بعد بنے گی اور وہ کچھ حصہ سیکنڈ کا سارا گزرنے کے بعد سیکنڈ کا لاکھواں حصہ ایسا ہوگا جس میں ہم اس شعور میں پہنچے ہیں جس میں اب بسر کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو کوئی پرواہ نہیں۔ اس کی رشد پر اس بات کا اثر نہیں پڑا، اس کے فہم اور اس کی عقل اور اس کی صنعت کاری پر اس بات کا کوئی اثر نہیں پڑا کہ کوئی دُنیا جانتی ہے یا نہیں جانتی، کسی کو بات پسند آتی ہے کہ نہیں پسند آتی۔ تو وہ عقل جو مستغنی ہو چکی ہو جو اپنی ذات میں قائم ہو اور کسی دیکھنے والے کی تحسین کی محتاج نہ رہی ہو وہ صحرا میں بھی لالہ کھلا رہی ہے جب کہ کوئی دیکھنے والا وجود نہیں، وہ لالہ کے ہر ذرہ میں اس کے پردوں میں ایسے ایسے حسن پیدا کر رہی ہے جس کو دیکھنے والا وجود بھی محسوس نہیں کر رہا۔ اس رشد کامل کو حلم کہتے ہیں۔ اور ان معنوں میں خدا تعالیٰ حلیم ہے کہ تم تسبیحوں سے واقف ہو یا نہ ہو خدا کے صنعت کے حسن سے آشنا ہو یا نہ ہو خدا اپنی ذات میں حلیم ہے اور وہ حلیم ہی رہے گا۔

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنْ تُقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا يُضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۚ وَاللَّهُ شَكُورٌ حَلِيمٌ ﴿۱۸﴾ (التغابن: ۱۸)

کہ تم جو خدا تعالیٰ کو قرضہ حسنہ دیتے ہو وہ تمہارے لئے اس کو بڑھاتا رہتا ہے اور اس کے نتیجہ میں تم سے مغفرت کا سلوک بھی فرماتا ہے وَاللَّهُ شَكُورٌ حَلِيمٌ۔ اللہ تعالیٰ بہت ہی خدمت کو قبول کرنے والا ہے۔ شکور خدمات کا بہترین نتیجہ دینے والا ہے، ان معنوں میں شکر ادا کرتا ہے تمہارا کہ تم جو کچھ اس کی خاطر کرتے ہو وہ اس کو قبول فرماتا ہے اسے استحسان کی نظر سے دیکھتا ہے اتنا نہیں دیتا جتنا تم نے کیا ہے اس سے بڑھ کر دیتا ہے۔

شکور کی تو سمجھ آ گئی حلیم کا کیا تعلق ہے یہاں؟ حلیم تو بردبار کو کہتے ہیں۔ اس میں بردباری کا کیا تعلق ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ خدا کی خاطر جو لوگ دیتے ہیں وہ بظاہر یہی سمجھ رہے ہوں کہ ہم بہترین چیز دے رہے ہیں۔ قرضہ حسنہ کا وہ مطلب نہیں ہے جو آپ یہاں دیتے ہیں قرضہ حسنہ۔ انسان جب قرضہ حسنہ دیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں جتنا دوں گا اتنا ہی واپس لوں گا۔ اس میں حسن تو محض نام کا ہے صرف عدل کا پہلو ہے۔ خدا تعالیٰ کو جب قرضہ حسنہ دیتے ہیں تو اس کے دو معانی ہیں ایک یہ کہ جتنا ہم دیں گے اس سے بے انتہا زیادہ لیں گے۔ یعنی یہ انسان کو یقین ہوتا ہے کہ میرا خدا مجھ سے یہ سلوک کرے گا دوسرا یہ کہ ہم اپنی چیزوں میں سے بہترین چیز دیں گے۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (آل عمران: ۹۳) میں جو مضمون ہے حسن کا وہی خدا کے تعلق میں جب قرضہ حسنہ بولا جاتا ہے تو اس میں وہ داخل ہو جاتا ہے۔

چنانچہ حضرت مصلح موعود نے تفسیر صغیر میں جو ترجمہ کیا وہ حیرت انگیز ترجمہ ہے چند لفظوں میں اس حسن کی طرف اشارہ کر دیا ہے آپؓ نے۔ فرماتے ہیں اس کا ترجمہ یہ ہے اور اگر تم اللہ کے لئے اپنے مالوں میں سے ایک اچھا حصہ کاٹ کر الگ کر دو یعنی قرضہ حسنہ سے مراد یہ ہے کہ اموال میں سے گندہ نہ دو بلکہ اچھا دو تب خدا کا یہ وعدہ ہے کہ وہ تم سے مغفرت کا سلوک کرے گا، تمہارے اموال کو بڑھائے گا لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں حلیم بھی ہوں اور میں جانتا ہوں تمہاری کمزوریوں کو اور میں جانتا ہوں کہ حسن کے نام پر تم بسا اوقات بہت گندی گندی چیزیں بھی میرے نام

پر دے جاتے ہو اور اکثر اوقات دینے والا اپنے مال کا بہترین دینے کی بجائے وہ حصہ پہلے نکالتا ہے جس کی اس کو ضرورت نہیں رہتی اور یہ بہت بڑی گستاخی ہے۔ ایک طرف محبوب کو تحفہ دینے کا دعویٰ ہو اور دوسری طرف گندی گندی چیزیں نکال کر دی جائیں یہاں تک کہ قرآن کریم ایک اور موقعہ پر بیان فرماتا ہے کہ ایسے مال نہ دیا کرو کہ اگر تمہیں دیئے بھی جائیں تو تمہاری نظریں شرم سے جھک جائیں۔ (البقرہ:۲۶۸)

تو اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ قرضہ حسنہ کے نام پر انسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس ظلم کا شکار ہو رہی ہوتی ہے کہ اپنے رب کے حضور ادنیٰ چیزیں دے رہی ہوتی ہے اور اس کا نام حسن رکھتی ہے اور کہتی ہے دیکھو! ہم نے خدا کی خاطر کیا کیا کچھ دے دیا۔ تو وہاں اللہ تعالیٰ کی صفت حلیم جو ہے وہ انسان کو اُس کے عذاب اور پکڑ سے بچاتی ہے۔ ورنہ دنیا میں ایک بادشاہ کے سامنے آپ سڑا ہوا مال لے کر چلیں جائیں تو لازماً وہ اس کی سزا سے بچ نہیں سکیں گے۔ چاہے غریب بھی انسان ہو اگر وہ تحفے کے طور پر ایک سبز پتا بھی توڑتا ہے تو لہلہاتا ہوا سبز پتہ توڑتا ہے، وہ یہ نہیں کرتا کہ سڑا ہوا بسا ہو جو گرا ہوا زمین پر پتہ اٹھا کر بادشاہ کو دے۔ بادشاہ تو امیر کے تحفے سے بھی مستغنی ہوتا ہے اور غریب کے تحفے سے بھی لیکن اس کے اندر جو حسن شامل ہو جاتا ہے وہ اس کو قبول کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ بھی حسن کو قبول کرتا ہے لیکن جانتا ہے کہ حسن کے نام پر انسان نہایت ہی بیہودہ چیزیں دے رہا ہوتا ہے اور پھر جو خدا کی خاطر مالی قربانی کے نظام میں شامل ہوتے ہیں ان کو حلیم بننا پڑتا ہے کیونکہ جب وہ خدا کی خاطر مال لینے کے لئے جاتے ہیں تو طرح طرح کی باتیں بھی سنتے ہیں، قرآن کریم ان باتوں کا ذکر بھی فرماتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں اچھا اللہ غریب ہے ہم امیر ہیں ہم سے مانگنے آئے ہو خدا کے لئے، عجیب وغریب طعنے دیتے ہیں اور چونکہ مالی لین دین کے معاملات میں یہ باتیں لازمی حصہ ہیں اس لئے حلیم بنے بغیر گزارہ نہیں ہو سکتا۔ ان بندوں کو بھی حلیم بننا پڑتا ہے جو خدا کی خاطر قربانی والے نظام سے وابستہ ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اگر حلیم نہ ہو تو بظاہر قربانی کرنے والے جو ہیں ہمیں ان کی اکثریت کو ہلاک کر دے اس سلوک کے نتیجہ میں جو وہ خدا کی خاطر مال دیتے وقت کرتے ہیں تو فرمایا میں غفور بھی ہوں اور حلیم بھی ہوں۔ یہ دونوں صفات جب مل جاتی ہیں تو نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ میں شکر کے ساتھ قبول کرتا ہوں۔ تم اپنی طرف سے

پتہ نہیں کیا کیا گمان کر کے چیزیں پیش کر رہے ہو؟ کیا کیا اُن میں کیڑے ہیں؟ کیا کیا ریا کاریاں ان میں داخل ہیں؟ یہ ساری باتیں بھی تو آجاتی ہیں اس میں۔ بظاہر دانہ مکمل ہے دیکھنے میں لیکن اندر سے اس کو گھن چاٹ چکا ہے۔ بہت سی انسان کی مالی قربانیاں انفاق فی سبیل اللہ کو ایسی بیماریاں لگی ہوئی ہیں یا ایسے ایسے کیڑے لگے ہوئے ہیں کہ وہ اندر سے کھا چکی ہوتی ہیں اُن قربانیوں کو بدخُلقی سے یا گندی چیز دینا تو ایک الگ معاملہ ہے اچھی چیز دیتے وقت بھی خدا کے سوا غیر اللہ کا خیال دل میں آجاتا ہے۔ ریا کاری کے نتیجہ میں انسان ایک قربانی کر رہا ہوتا ہے تو اکثر اموال تو گندے ہو جاتے ہیں۔ یہ خدا تعالیٰ حلیم ہے جو ان کو شکر کے ساتھ قبول کرتا ہے۔ وہ ہماری پردہ پوشی بھی فرماتا ہے ہم سے بخشش کا سلوک بھی فرماتا ہے اور فرماتا ہے میں تمہارا ممنون ہوں تمہارا مشکور ہوں۔ تمہارے لئے میں اس کو بڑھا دوں گا۔ کیسا عظیم خدا ہے! اور یہ ہے حِلم کی صفت جو انسان کے کام آتی ہے اس موقع پر اور بندہ کو بھی یہی تعلیم خدا تعالیٰ نے دی ہوئی ہے کہ تم بھی حلیم بنو، بندوں سے حلم کا سلوک کیا کرو، ان کی کمزور چیزیں بھی بظاہر پردہ پوشی کرتے ہوئے تعریف کے ساتھ قبول کر لیا کرو۔ عظیم گر ہے یہ معاشرہ کو سدھارنے کا اور اس میں حسن پیدا کرنے کا۔ پس جو بندے دوسرے بندوں سے حلیم بنیں گے اللہ تعالیٰ ان کے لئے حلیم بنے گا۔

پھر ایک اور جگہ حلم کے مضمون کو واضح کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾ (التوبۃ: ۱۱۴)

کہ دیکھو ابراہیمؑ کا اپنے باپ کے لئے جو استغفار تھا وہ صرف اس لئے تھا کہ اس نے وعدہ کر لیا تھا اپنے باپ سے کہ میں تمہارے لئے ضرور خدا سے بخشش کی دعا کروں گا لیکن جب اس پر یہ بات روشن ہوگئی اور کھل گئی کہ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ کہ وہ خدا کا دشمن ہے تَبَرَّاَ مِنْهُ وہ اس سے بیزار ہو گیا اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ابراہیمؑ بہت ہی نرم مزاج اور نرم خو اور نرم دل انسان تھا اور حلیم بھی تھا۔

جو موقعہ کی مناسبت ہے اس سے اوّاہ کی صفت تو کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ دل میں نرمی تھی

اس لئے اُس نے بخشش کا وعدہ کر لیا لیکن حلیم کا اس مضمون میں کیا تعلق ہے؟ یہ ہے گفتگو، قابل غور بات یہ سامنے آنی چاہئے کہ اوّاہٌ کی جو آپ کو سمجھ آ گئی کہ بہت ہی نرم دل تھا اپنے باپ سے اس نے وعدہ کر لیا کہ میں استغفار کروں گا تو حلیم نے ہمیں یہاں کیا مضمون سکھایا؟

اصل میں کوئی صفت بھی فی ذاتہٖ اچھی یا بری نہیں کہلا سکتی جب تک اس کے اردگرد کی صفات پر غور کر کے اس کے جوڑ کا مشاہدہ نہ کیا جائے کہ اس کا اور صفات سے کیا تعلق ہے۔ اب نرم دلی فی ذاتہٖ اگر رشد سے خالی ہو، اگر عقل سے خالی ہو جائے تو وہ جانوروں کی طرح کی ایک کمزوری ہے اس سے زیادہ اس میں کوئی حسن نہیں ہے۔ موقع بے موقع ہر محل پر انسان نرم دل ہوتا چلا جائے تو یہ تو ایک کمزوری ہے یہ حسن ہے ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ یہ بیان فرمانا چاہتا ہے کہ ابراہیمؑ کو اپنے باپ سے محبت تھی وہ بڑا نرم دل تھا اس کے باوجود وہ صاحب رشد تھا اور اس وجہ سے وہ قابل تعریف تھا۔ کہ موقع و محل کے لحاظ سے اس کی نرمی ایک عزم میں تبدیل ہو جاتی تھی جو بظاہر سختی سے نظر آتی تھی۔ جب اس کی دل کی نرمی اپنے باپ کے لئے تھی تو اس وجہ سے تھی کہ اس کو پورا علم نہیں تھا کہ یہ میرے محبوب کا دشمن ہے۔ وہ جہالت کا حق دے رہے ہوں گے وہ اور کئی قسم کی ان کے اوپر حسن ظنیاں کر کے پردے ڈال رہے ہوں گے اور دل کی نرمی کے ساتھ یہ وعدہ کر لیا کہ میں اس کے لئے استغفار کروں گا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کو روشن فرمایا کہ یہ شخص ایسا ہے جس پر حجت تمام ہو چکی ہے اس کو کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ جسکو کہتے ہیں (Committed Enemy) یہ واضح بین طور پر اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے تو وہاں رشد دل کی نرمی پر غالب آ گئی دل کی نرمی رشد پر غالب نہیں آئی۔

یعنی رشد ایسی عقل کو کہتے ہیں جو جذبات کے تابع نہیں ہوتی اور جذبات اس کے تابع ہوتے ہیں اور جب وہ جذبات کو تابع کرتی ہے تو جذبات میں حسن پیدا کر دیتی ہے بجائے اس کے کہ ان کو گندا کر دے یا ان کے اندر ایک نامناسب رنگ داخل کر دے۔

تو دل کی نرمی تب حسن بنتی ہے اگر اس کا حلم کے ساتھ جوڑ ہو اگر حلم کے ساتھ جوڑ نہ تو دل کی نرمی ایک جہالت بن جائے گی ایک نہایت ہی بدصورت چیز بن جائے گی کہ ایک طرف ایک اعلیٰ ذات ہے اور اسکی دشمنی ہے ایک وجود کو اور جو وجود اس محبوب کا دشمن ہے جو ایک بہت

بڑی اعلیٰ ذات ہے۔ دل کی نرمی اس کے لئے فائدہ میں جارہی ہے یعنی مقابلہ ہورہا ہے بیچ میں ایک، توازن بگڑ گیا اور پاگل پن بن گیا یہ۔ اچھی دل کی نرمی ہے کہ اپنے محبوب کے دشمن کے حق میں ہو جاؤ اور محبوب کے خلاف نتیجہ نکالو۔

تو یہ رشد ہے یعنی حلم جو جذبات میں توازن بھی پیدا کرتا ہے اور حسن پیدا کرتا ہے اور صرف یہی جذبات نہیں جیسا کہ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں غصہ کے جذبات نرمی کے جذبات، کسی قسم کے جذبات ہوں ان سب پر جب تک حلم حاوی نہ ہو اس وقت تک ان میں کوئی حسن پیدا نہیں ہوتا۔ آگے اور بعض آیات تھیں مگر وقت زیادہ ہو رہا ہے اس لئے انکو چھوڑ دیتا ہوں اب میں چند حدیثیں اس مضمون پر سناتا ہوں۔ آنحضور ﷺ نے جو بہادری کی تعریف فرمائی ہے اس میں بھی حلم داخل ہے۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں:

لَيْسَ الشَّدِيْدُ بِالصُّرَعَةِ اِنَّمَا الشَّدِيْدُ الَّذِىْ يَمْلِكُ نَفْسَه‘ عِنْدَ الغَضَب

(صحیح بخاری کتاب الادب باب الغضب والکبر)

کہ بہادر وہ نہیں ہے جو لوگوں کو پچھاڑ دے بہادر وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے۔ تو حلم کا ایک یہ بھی معنی ہے جیسا کہ قرآن کریم کی آیت سے پتہ چلا جذبات سے مغلوب نہ ہو اور سب سے زیادہ مغلوب کرنے والا جذبہ غصہ ہوا کرتا ہے۔ تو حلم کے اندر ایک بہادری بھی پائی جاتی ہے یعنی اعلیٰ قسم کا بہادر وہ ہوگا جو بہت بڑا حلیم ہوگا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں اسکو غصہ نہ دلائیں بلکہ جب غصہ کی آزمائش میں مبتلا ہو پھر بھی وہ رک جائے اور غور کے بعد تحمل کے ساتھ فیصلہ کرے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں:

’’مومن میں شتاب کاری نہیں ہوتی بلکہ وہ نہایت ہوشیاری اور تحمل کے ساتھ نصرت دین کے لئے تیار رہتا ہے اور بزدل نہیں ہوتا‘‘۔

ایک چھوٹے سے جملے میں حلم کے اتنے پہلو بیان فرما گئے ہیں حضرت مسیح موعودؑ کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ایک ہی فقرہ ہے اور پوری تقریر ہوگئی ہے حلم کے اوپر۔ اور انسان جو داعی الی اللہ ہو اس کو حلم کی کیوں ضرورت درپیش ہے اُسکے اوپر روشنی ڈال دی آپؑ نے۔ فرماتے ہیں مومن میں شتاب کاری نہیں ہوتی یعنی حلم حوصلہ دیتا ہے فوری طور پر انسان قدم نہیں اٹھاتا جاہلوں کی طرح کہ

ادھر بات ہوئی ادھر اس کا نتیجہ نکل آیا بلکہ وہ نہایت ہوشیاری اور تحمل کے ساتھ، یعنی حلم کے اندر یہ دو باتیں پائی جاتی ہیں، ہوشیاری بھی ہے اور تحمل بھی ہے۔ تحمل بریکوں کا کام دیتا ہے یعنی جس طرح لگام ڈالی جاتی ہے گھوڑے کو، اس لئے ڈالی جاتی ہے کہ وہ بھاگتے بھاگتے کہیں حد سے زیادہ آگے نہ نکل جائے، ٹکریں ہی نہ مارتا پھرے کہیں، لگام کے مقابل پر مہمیز ہوتی ہے جو اس کو آگے دوڑاتی ہے تو جب جذبات انسان کے اندر داخل ہوتے ہیں تو وہ مہمیز کا کام دیتے ہیں۔ ہمیشہ انسان کی قوت متحرکہ میں سب سے بڑا کردار اس کے جذبات ادا کرتے ہیں جب یہ غالب آجائیں تو بے نیاز ہو جاتا ہے کہ اس پر کیا گزرے گی؟ اس لئے جو محبت میں دیوانے ہو جاتے ہیں ان کو کوئی پرواہ نہیں ہوتی اُن کا وجود مٹ جائے اس راہ میں کیونکہ جذبات کی مہمیز بہت سخت ہوتی ہے اور حلم کیا کرتا ہے؟ حلم لگام دیتا ہے اور ایک متوازن سواری بنا دیتا ہے۔ جتنی تیز رفتار سواری ہو اتنی ہی مضبوط لگام ضروری ہے۔ جتنی تیز رفتار موٹر ہوگی اتنی ہی اچھی اس کے لئے ڈسک بریکیں ہوں گی اور اعلیٰ انتظام ہوں گے کہ وقت کے اوپر رک بھی سکے۔ تو حلم اور جذبات کا یہی وہ جوڑ ہے۔ یہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس فقرے میں ظاہر فرمایا ''وہ نہایت ہوشیاری اور تحمل کے ساتھ نصرتِ دین کے لئے تیار رہتا ہے''

یعنی بے قرار ہر وقت رہتا ہے کہ میں ہر موقع پر خدا کے دین کی خدمت کروں دعوت الی اللہ سے باز نہیں آتا لیکن جاہلوں کی طرح جھٹکا دے کر نہیں کام کرتا بلکہ موقع اور محل کی مناسبت کے ساتھ بہر حال وہ رکتا نہیں ہے لیکن اس میں ہوشیاری پیدا ہو جاتی ہے۔ اس میں تحمل پیدا ہو جاتا ہے اور بزدل نہیں ہوتا۔ جیسا کہ میں نے بیان کیا جب انسان رکتا ہے کسی حرکت سے تو وہ بزدلی کے نتیجہ میں بھی رک سکتا ہے اور حلم کے نتیجہ میں بھی رک سکتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے واضح فرمایا مضمون کو کہ مومن بزدلی کے نتیجہ میں باز نہیں آیا کرتا حلم کے نتیجہ میں باز آتا ہے۔ تو کوئی غلطی سے مومن کو یہ نہ سمجھ لے کہیں کہ وہ بڑا ڈرپوک ہے ہم نے اتنی گالیاں دیں اتنا مارا کوٹا اتنی آگیں لگانے کی تعلیم دی اتنے انکے بزرگوں کی تحقیر کی اور انکو ذلیل ورسوا قرار دیا اس کے باوجود یہ ہاتھ ہی نہیں اٹھا رہا سامنے سے۔ تو کوئی غلط فہمی میں مومن کے بارے میں مبتلا نہ ہو جائے مومن کا وہ تصور جو قرآن اور حدیث پیش کر رہے ہیں وہ تو ایک بہت عظیم الشان تصور ہے، مومن اپنے مقصد سے باز نہیں آئے گا، اگر بزدل ہوتا تو تمہارے ڈراووں اور تمہاری دھمکیوں کے نتیجہ میں اپنے مقصد سے باز آجاتا، کسی

قیمت پر ایک لمحہ کے لئے بھی مومن اپنے مقصد سے باز نہیں رہ سکتا۔ ہاں وہ حلیم ہے، وہ صاحب رشد ہے، وہ شتاب کار نہیں ہے، وہ جانتا ہے کہ اس کے مقصد کو کیا چیز زیادہ فائدہ پہنچائے گی اور اس کے نتیجہ میں اس کے عمل میں اور اس کی کوششوں میں ایک ملائمت ، ایک تہذیب داخل ہو جاتی ہے، انسانیت آجاتی ہے، وہ حیوانیت کا مقابلہ حیوانیت سے نہیں بلکہ انسانیت سے کرتا ہے اور یہ ساری چیزیں حلم ہمیں سکھاتا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام حلم کے ایک بہت ہی بلند مقام پر فائز فرمائے گئے تھے، صرف کہتے نہ تھے بلکہ وہی عمل بھی تھا آپ کا۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک روز ایک ہندوستانی جس کو اپنے علم پر بڑا ناز تھا اور اپنے تئیں جہاں گرد اور سرد و گرم زمانہ دیدہ و چشیدہ ظاہر کرتا تھا مسجد میں آیا اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے آپ کے دعویٰ کی نسبت بڑی گستاخی سے باب کلام وا کیا، نہایت ہی بدتمیزی اور بدخلقی سے سوال شروع کیا آپ کے دعوی کے متعلق اور تھوڑی گفتگو کے بعد کئی دفعہ یہ کہا کہ آپ اپنے دعویٰ میں کاذب ہیں جھوٹے ہیں اور میں نے ایسے مکار بہت سے دیکھے ہوئے ہیں اور میں تو ایسے کئی بغل میں دبائے پھرتا ہوں۔ غرض ایسے ہی بے باکانہ الفاظ کہے مگر آپؑ کی پیشانی پہ بل تک نہ آیا، بڑے سکون سے سنتے رہے اور پھر بڑی نرمی سے اپنی نوبت پر کلام شروع کیا۔ اس کو کہتے ہیں مجسّمہ حلم۔

تو اللہ تعالیٰ جماعت احمدیہ کو حلم عطا فرمائے اور خدا تعالیٰ سے رنگ سیکھنے کی توفیق بخشے اس کی اپنی صفات کے کیونکہ اگر ہم خدا کے رنگ اللہ سے سیکھ جائیں۔ قرآن اور رسول سے سیکھ جائیں اتنی عظیم الشان طاقت دنیا میں بن جائیں گے اور ایسی ہیشگی ہمیں نصیب ہو جائے گی کہ ہمارے مقدر میں مٹنا ہو ہی نہیں سکتا۔ ناممکن ہے ساری کائنات مٹ جائے مگر احمدیت نہیں مٹے گی اگر خدا کے رنگ میں رنگین ہو جائے۔

خطبہ ثانیہ کے دوران فرمایا:

پہلے میں کئی بار احباب جماعت کو توجہ دلا چکا ہوں کہ افریقہ کے ممالک کے لئے دعا کریں وہاں بارش کی کمی کی وجہ سے انسانیت بہت ہی دکھوں میں مبتلا ہے یعنی انسان جو افریقہ میں بس رہا ہے بہت مصائب کا شکار ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا اور اس کے بعد اچھی اچھی خبریں آئیں اور

خوشیوں کے خط آئے اور احمدیوں کی طرف سے جو ساری دنیا سے خط آتے ہیں ان میں افریقہ کا بھی ایک بڑا حصہ ہے تو بہت ہی اطمینان کا اظہار کیا کہ اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا بارشیں دیں بہتر حالات ہو گئے ۔لیکن معلوم ہوتا ہے کہ دعائیں پھر جماعت نے چھوڑ دی ہیں کیونکہ اب پھر کچھ تشویش کے خط آنے لگ گئے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب دوبارہ خشک سالی کے آثار ہیں اس لئے دعا کریں۔

تو ساری جماعت دعا کو جاری رکھے بھولے نہیں اور بہت اخلاص کے ساتھ گریہ وزاری کے ساتھ دعائیں کرے۔ اگر خدا تعالیٰ قبولیت کے مزاج میں ہو تو ایک آنسو جو مقبول ہو جاتا ہے وہ سارے جہان کے لئے رحمت کی بارش بن سکتا ہے اس لئے خدا تعالیٰ ہمیں وہ آنسو نصیب فرما دے جس سے سارے جہان پر رحمتوں کی بارش برسنے لگے۔ اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو۔ آمین۔